اشکوں میں دھنک

جاوید انور



اشکوں میں دھنک

جاوید انور

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

ہماری کتابیں .....

خوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ:

باراوّل : اپریل ۱۹۹۴ء

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

کتابت : محمد اشرف انجم

تعداد : پانچ سو

قیمت : ۶۰/- روپے

انتساب

احمد ندیم قاسمی

کے نام

فہرست

میں تیرے واسطے اِک نظم لکھنا چاہتا ہوں

میں تیرے واسطے اک نظم لکھنا چاہتا ہوں

کسی صحرا کی خواہش دل میں رکھے اپنے گھر کا راستہ بھولی ہوئی چڑیا
میں تیرے واسطے اک نظم لکھنا چاہتا ہوں

مری مٹھی میں صحرا ہے
مگر میں چاندنی کے کینوس پر پھول اور تتلی کے رنگوں سے تجھے
تصویر کرنا چاہتا ہوں

میں تیری سبز آنکھوں کی ہتھیلی پہ گلابی خواب دھرنا چاہتا ہوں
کئی ویران درگاہیں کئی اجڑے محل پل پل ہماری راہ کی دیوار
بنتے ہیں، کئی دروازے کھلتے ہیں

مگر میں صرف چلنا چاہتا ہوں
صرف چلنا چاہتا ہوں اُس تمنّا میں جو صحرا کے اُدھر شوریدہ سر دریا
میں اک ٹوٹی ہوئی کشتی میں سوتی ہے

کبھی اُکھڑی ہوئی چھت پر تارے ٹانکتی ہے اور کبھی آنسو پڑتی ہے
میں اپنی ریت میں کچھ ابر بونا چاہتا ہوں
شعر ہونا چاہتا ہوں
شعر بھی مقطع کا جس میں دو تخلّص ہوں اور اس کا دوسرا مصرع ترا ہو
میں پتھر ہوں چٹخنا چاہتا ہوں اور جھرنے کے ترنّم پر کوئی سنگیت
بُننا چاہتا ہوں

میں اپنے بادباں پر پانیوں سے اور ہوا سے جنگ اپنے چپوؤں پہ
جیتنے کا عزم لکھنا چاہتا ہوں
میں تیرے واسطے اِک نظم لکھنا چاہتا ہوں

دهنک مقفل

اے ٹہنی تجھ پہ رنگ اتریں

اے ٹہنی تجھ پہ رنگ اُتریں
میں خوشبو بن کر آؤں
میں حرفِ دُعا
میں دستِ دُعا
میں داسی بن کر گاؤں
اے ٹہنی تجھ پہ رنگ اُتریں
میں خوشبو بن کر آؤں
اور وہیں رہ جاؤں

اے طائر تیری آنکھوں میں
میں سپنا بن کر آؤں
میں صبحِ سفر
میں شامِ حضر
میں تیرا نگر بن جاؤں
اے ٹہنی تجھ پر رنگ اُتریں
میں خوشبو بن کر آؤں
اور وہیں رہ جاؤں

اے تتلی تیرے گلشن میں
میں بادِ صبا کہلاؤں
ہولے ہولے
مدھم مدھم
میں چھم چھم کرتی آؤں

اے ٹہنی تجھ پر رنگ اُتریں
میں خوشبو بن کر آؤں
اور وہیں رہ جاؤں

ہسپتال میں ایک لوری

ممّا کی میرا جی
پپّا کی میرا جی
دیکھو ہم نے آنکھوں میں کیا
رنگ برنگے پھول کھلا رکھے ہیں
ان پھولوں سے کھیلو
ہم نے اپنی سانسوں سے جو محل بنا رکھے ہیں
اُن میں آکر ٹھہرو

ان آنکھوں سے بینائی لو
ان ہونٹوں سے نغمے
نیند بھرے سُر پپّا سے لو
دودھ بھرے بوسے ممّا سے
دیکھو،
تتلی، جگنو
پھول، ستارا
ممّی، پپّا تمہیں بلاتے ہیں!

ایک دُعا

دھند میں سانس کا پھول کھلایا
قطرے کو گہرائی دی
تُو نے چُپ کو چیخ بنایا
مٹی کو گویائی دی

تُو لمحے کو صدی بنائے
اور سُر کو کرے ترانہ
میرے پاس اِک خالی جھولی
اور تیرے پاس خزانہ

یہ جھولی بھی بھر دے مولا
اب یہ جھولی بھی بھر دے
یہ کونپل بھی شاخ بنا
اور شاخ گلوں کا گھر کر دے

۵

آخری سے پہلا مکالمہ

پیاری میرا
کبھی کبھی تُو تھکی تھکی سی لگتی ہے تو
دل روتا ہے
دل ٹکڑے ہوتا ہے
جب تُو درد بھری نظروں سے ہم کو تکتی ہے
ہولے سے
رونے کی کوشش میں

پیاری میرا
ممکن ہو تو تجھے ہم اپنے دل کی حرارت گاہ میں رکھ لیں
سانسوں کے کمبل میں لپیٹ کے
تو جو دُنیا دیکھنے سے پہلے ہی
درد کو اپنانا اور سہنا جان چکی ہے

اتنی ننھی عمر میں تو نے

اتنی عمریں جی لی ہیں جو ہم نے بھی نہیں جیں
ننھے منے دل کے تیشے کی ضربوں سے تو نے
سنگی دیواروں میں رخنے کر ڈالے ہیں!

پیاری میرا

دیکھ تری آنکھوں میں کرنیں دیکھ کے،
پپا، مما کی آنکھوں میں سورج چمک رہے ہیں
حوصلہ رکھنا بیٹی، ہم بھی حوصلہ رکھیں گے

ایک نامکمل نظم

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے
چلتے چلتے رستہ اچانک رک جاتا ہے
کسی کھنڈر میں
جہاں ہوائیں ۔
دمہ زدہ چھاتی میں سانسیں سیٹیاں مارتی ہیں
جہاں صدائیں صدیوں کے ملبے میں سسکی بن کر گونجتی ہیں
ہاں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے
کبھی کبھی جب پانی دریا چھوڑ کے صحنوں کا رُخ کر لیتے ہیں
سورج چھتوں کے نیچے آجاتا ہے
جب افلاک سجود سے رشتہ توڑ کے اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں
مٹی قبر کی مٹی بن جاتی ہے

مٹی تیرے ساز نرالے
تیری دُھن پر دنیا ناچے
عمروں کے اس دشت کی تیاحی کا حاصل
اور لاحاصل بھی تو

تُو عہدِ گماں
تُو گورِ زماں
تو نیند ہماری میرا کی

ہم خواب ترے
ہم خواب، ادھورے خواب فقط
ہم ہفت افلاک کی ڈھلوانوں سے پھسلے ہوئے ارباب فقط

بڑی پرانی قبریں ہیں جو اپنے دریچے کھول رہی ہیں
تیز ہوا ہے
بڑے پرانے خط ہیں میرے نام جو پتّہ پتّہ بوڑھا برگد میرے صحن
میں پھینک رہا ہے

بوڑھا برگد
ازلوں کی چڑیا کا معبد، ریشِ ابد ہے

بے حد گنجلک

بے حد سادہ

صبحِ ارادہ

شامِ وعدہ

کس نے کس سے عہد نبھایا

کون دسمبر کی راتوں میں کس سے ملنے آیا

برفایا، برفایا

برگد کس نے عہد نبھایا

کس بادل نے چھتری بھیجی

کس سورج نے چھایا

برگد کس نے عہد نبھایا

کیسے عہد اور کیسی قسمیں

ماہِ محرم کی سب رسمیں بے معنی بے وقعت

پیرائے بے معنی بے وقعت

چرخ سیہ پر کالے طائر

بجھتی آنکھیں، جلتے منظر

اسپِ بے شبیر کا ماتم، گریہ

میراؔ بے معنی بے وقعت

صبح سفر اور میراؔ میرا
شام حضر اور میرا
میراؔ ابھی تو ہم نے تیری انگلی پکڑ کے چلنا سیکھنا تھا
ابھی تو ہم نے تیری آنکھ سے دنیا دیکھنا تھی
ابھی تو پھول بہت مہنگے تھے
تُو نے اتنی جلدی کیوں کی جلنے میں
تُو چلی گئی
تو اپنی سانس کا داغ دھکتا چھوڑ کے ان سینوں میں
ان سینوں کا بھید ہوئی
ہم کھڑے رہے!

میرا تجھے یاد کرتا ہوں میں

میں یہاں رات کی سرحدوں پہ کھڑا
تجھ کو آواز دیتا ہوں سوتا نہیں ہوں
میں قبروں کی مٹی سے آنکھیں بناتا ہوں
روتا نہیں ہوں
وہ اک پھول تھا
پھول ہے جس نے مشرق کو مغرب سے باندھا تھا
باندھا ہوا ہے
میں اُس پھول کے سائے میں چاند رکھتا ہوں
میرا تجھے یاد کرتا ہوں میں

یہ کولمبس یہ سکندر تیرے

منڈیلا ۸۸

لحظہ لحظہ بجھتے سورج، جلتی کٹیا، بھاری بُوٹوں کی ٹھپ ٹھپ
گمنام شہید
نفرت کا بارود، سرنگیں، جیلیں، کتّے، لوگ
میں ٹی وی کی خبروں میں
میں تہذیب کی قبروں میں اِک پھٹی ہوئی تصویر
شباہت، رنگ، صدا، تحریر
سمندر خشک، سیاہی بادل
جلتے کاغذ

ایک دُنیا کہ جسے
یہ بسر کر بھی چکے
جس کو یہ پیچھے، بہت پیچھے کہیں چھوڑ آئے
ڈھول میں بھول کی صورت، لیکن
اب بھی وہ شہد کی مکھی کی طرح
گونجتی رہتی ہے اُن کے سر میں
لامکانی کے جزیروں پہ، زمانوں سے پرے
خواب اور نیند کے تہواروں میں
سارے جمعوں، سبھی اتواروں میں!

آخری بار جب میں تیرے ساتھ تھا

آخری بار جب میں تیرے ساتھ تھا
تو، عزادار میں نے، تجھے کیا بتاؤں کہ پھر،
سالہاسال کے بعد اُس
طائرِ بے زمان و مکاں کے پروں کی وہی پھڑپھڑاہٹ سُنی
جو ہمیں
سالہاسال تک
پانچویں سمت کے سبز تالاب پر
روز و شب
قتل کرتی رہی

آخری بار جب میں تیرے ساتھ تھا
تو عزادار میں نے تری آنکھ میں
سالہا سال کے بعد پھر اُس پرندے کو دیکھا
وہ قاتل نہیں
کوئی مقتول تھا
اور میں ڈر گیا!

ریچھ کیوں ناچتا ہے

اے مداری، ترے
زرد چہرے سے باہر نکلتی ہوئی
ہڈیوں میں دھنسی
آنکھ کی ایک ہلکی سی جنبش پہ ہی
ریچھ کیوں ناچنے لگ گیا
مجھ کو معلوم ہے

۵

مجھ کو معلوم ہے
تار پر چلنے والی حسینہ کی یہ مسکراہٹ فقط
اُس کے ہونٹوں پہ کیوں
آنکھ میں کیوں نہیں

اور تماشائی کیوں
اس قدر زور سے
تالیاں پیٹتے ہیں کہ چولہوں پہ رکھی ہوئی
ہیویاں
صرف بستر کی چادر بدلتی ہیں کپڑے بدلتی نہیں

مجھ کو معلوم ہے
مورچے میں ہنسی برف کیسے بنی
شہر میں آگ کیسے لگی
کیسے کپتان دھسکی کا رسیا بنا
اور سپاہی نے اعزاز ٹھکرا دیا جو کہ چاندی کا تھا
ٹانگ لکڑی کی تھی
جو وہ چالیس برس تک پہنتا رہا

مجھ کو معلوم ہے
ساتویں آسماں پہ کوئی
اپنی جنت میں لیٹا ہے دوزخ کا ہیٹر جلائے ہوئے
اور ہاتھوں میں ریموٹ پکڑے ہوئے
اپنے ٹی وی پہ سب دیکھتا ہے جو ہم اور تم
کر رہے ہیں مگر
کتنی سردی ہے اس شہر میں
مجھ کو معلوم ہے
اور اس کو نہیں

مستقبل کے نوجوان شاعر سے

جیکٹ پہنو
جین چڑھاؤ
بوٹوں کے تسمے اچھی طرح کس لو
دروازے پر
کسی بھی لمحے دستک ہو سکتی ہے!

پاگل نہ بنو
اب کوئی نظم سنانے یا سننے نہیں آئے گا
کاغذ پھاڑ دو
پنسل توڑ دو
رکھ سکتے ہو تو یہ بھیجا روشندان میں رکھ دو
بھوکی چڑیا کے کام آجائے گا!

ہاں تسمے اچھی طرح کس لو
باہر تارکول پہ
لوہا دوڑ رہا ہے
اِک سو بیس اور اک سو چالِس کی رفتار سے
اس سے کم پر چلنا
اپنی موت کو دعوت دینا ہے، اور
اپنی موت کو دعوت دینا جرم ہے!

کسی بھی لمحے سائرن ہو سکتا ہے
وقت بہت کم
جنگ بڑی شدت سے جاری ہے، تم
زندہ رہنا
لڑنا چاہتے ہو تو
باہر نکلو
دوڑو
ورنہ اپنی نظم سمیت اس ڈسٹ بن میں گھس جاؤ!

پورٹریٹ آف اے لیڈی

دہائی ہے
کہ جن گملوں میں اُس کے پھول کھلتے تھے
وہ اُن کو توڑ آئی ہے

ہُما جب اُن گلابی چھاتیوں کی شاخ پر اُترا
تو اُن میں تیر تھے اور وہ کمانیں تھیں
تنائو میں

اب اُس کا لعل چڑیوں کی چگائی ہے
دہائی ہے،
کہ شہزادی خود اپنی آگ اپنے پانیوں میں پھینک آئی ہے!

بوڑھا شرابی — ایک مکالمہ

(۱)

نہیں نہیں تُم مرے نہیں ہو

(۲)

طویل جنگِ عظیم دوئم
کہ برف کی نصف صد تہوں کے تلے دبی ہے
مَری نہیں ہے

سفید بالوں کے موُچے میں
یہ گوُنج اُن گولیوں کی ہے جو چلی نہیں ہیں
دھوئیں کی زرہیں
بیئر کی ڈھالیں

مگر خزاں پیڑ کی جڑوں میں پنپ رہی ہے

(۳)

جراحتیں زخم زخم گریاں
کہ سالخوردہ
جو پچھلے ستّر برس سے بس موت جی رہا تھا
مرا نہیں ہے

(۴)

بہت پرانی کہانیاں ہیں

(۵)

سحر کے حصے میں راکھ آئی
گناہ سارے شبوں کی فہرست میں لکھے تھے
یہ رات کس سے کہے کہ بھائی
"جو چاند نکلا
تو جھیل ویران ہو چکی تھی
چکور جاگا —
چکور جاگا تو خواب آنکھیں چرا چکا تھا
جو شاہزادی نے حوض میں اپنا پھول رکھا

تو دیپ خیمے جلا چکا تھا!
سحر کے حصے میں راکھ آئی
یہ رات کس سے کہے کہ بھائی۔!

(۶)

رفاقتیں حرف حرف خنداں
کہ بارشوں میں پڑا ہوا بُوٹ خود ہی گلدان بن گیا ہے

(۷)

بخیل کمرہ
کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن
زبان رکھتے ہیں کان اور دل کہاں سے لاؤ
سو ۵ فٹ × ۸ فٹ × ۷ فٹ جس میں چارپائی بھی
اور تنہائی بھی مقیّد
کچن میں آؤ، کچن سے جاؤ
کہ کھیل کے لان میں، گلی میں، دکان میں ایڈز پھر رہی ہے
گھڑی کی سوئی پہ بیٹھ کر سال کی مسافت
پتہ چلے تم کو عمر کیا ہے۔!

(۸)

رفاقتیں حرف حرف خنداں
جراحتیں زخم زخم گریاں
طویل جنگِ عظیم دوئم
سحر کے حصے میں راکھ آئی!

(۹)

نہیں نہیں میں ——!
نہیں نہیں میں ——!
نہیں نہیں میں نہیں ہوں زندہ
نہیں نہیں میں مرا نہیں ہوں!

لورکا! لورکا!!

تیری جھیلوں میں کس بیل کا عکس ہے؟
تیری گلیوں میں کس حشر کا رقص ہے؟
تیری نارنگیاں کیوں لہو رنگ ہیں لورکا؟
لورکا! تیری سارنگیاں
چاندنی رات میں کس کے ماتم کی دھن چھیڑتی ہیں کہ بادِ صبا
گنگناتی نہیں
مسجدِ قرطبہ کے شکستہ مناروں میں سوئے کبوتر جگاتی نہیں

دھنک مقتل

منڈیروں پر دسمبر ہے
لہو میں ہجر کے نغمے
زباں پر وصل کی تحریر، آدھا تیر، باقی ہے
اسے زنجیر کیا کرنا!

مرے جوتوں میں کس کے پاؤں تھے او میرے شہزادے

مرے قاتل تری آنکھوں سے میں نے ایک ہی مقتل دھنک دیکھی
فرشتے رقص میں تھے ـــــ خواب سے جاگی
تو سنڈریلا کا آدھا دھڑ ہی غائب تھا!
ـــــ کبوتر عنبر کے آنگن میں سارے خط گرا آیا

کہا تو تھا
مصوّرات کی تصویر میں مہتاب دروازہ نہیں رکھنا
وگرنہ چور گھس آئے گا
اور گھر میں فقط اک خواب ہی تو ہے!

بہت ہی دودھیا منظر
چنبیلی میرے حصّے کی ہوا میں سانس لیتی ہے
بہت اونچی فصیلوں کی سفیدی میں
ہیولا مسکراتی نرس کا اور ان گنت نرسیں

مسیحا اپنی وردی میں صلیبوں کا سفر آسان کرتے ہیں
مرے پہلو میں میری فاختہ ـــ میرا،
ابھی ہم نے بہت سے رنگ چننا تھے
مگر تو دُودھیا منظر سے واپس ہی نہیں آئی!

کوئی پھولوں کو پانی دے
نہ دے، کوئی دیے روشن کرے
یا آندھیاں آئیں
لحد مٹی کی ہو یا سنگِ مرمر کی
پسِ کتبہ فقط کچھ جگمگاتی ہڈیاں
اک پھول لیٹے کا!

ہم کہ ہیں سفر نہیں

ہم خزاں کی غدود سے چل کر
خود دسمبر کی کوکھ تک آتے
ہم کو فٹ پاتھ پر حیات ملی
ہم تپنگوں پہ لیٹ کر روتے

سورجوں نے ہمارے ہونٹوں پر
اپنے ہونٹوں کا شہد ٹپکایا
اور ہماری شکم تسلی کو
جون کی چھاتیوں میں دودھ آیا

برف بستر بنی ہمارے لیے
اور دوزخ کے سُرخ ریشم سے
ہم نے اپنے لیے لحاف بُنے

زرد شریان کو دھوئیں سے بھرا
پھیپھڑوں پر سیاہ راکھ ملی
ناگا ساکی میں پھول کاشت کیے
نظم بیروت میں مکمل کی

لورکا کو کلائی پر باندھا
ہوچی منہ کو نیام میں رکھا
ساڑھے لینن بجے سکول گئے
صبح عیسیٰ کو شام میں رکھا

ارمغانِ حجاز میں سوتے
ہولی وڈ کی اذان پر جاگے
ڈائری میں سدھارتھا لکھا

درد کو فلسفے کی لوری دی
زخم پر شاعری کا پھاہا رکھا
تن مشینوں کی تھاپ پر تھرکے
دل کتابوں کی تال پر ناچا

ہم نے فرعون کا قصیدہ لکھا
ہم نے کوفے میں مرثیے بیچے
ہم نے بوسوں کا کاروبار کیا
ہم نے آنکھوں کے آئینے بیچے

زندگی کی لگن نہیں ہم کو
زندگی کی ہمیں تھکن بھی نہیں
ہم کہ ہیرو نہیں، ولن بھی نہیں

برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر

برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر
میرے ہی نقشِ قدم میرے سپاہی ہیں
مِرا حوصلہ ہیں

زندگیاں
اپنے گناہوں کی پناہ گاہوں میں ہیں
رقص کناں
روشنیاں
بند دروازوں کی درزوں سے ٹپکتی ہوئی
قطرہ قطرہ

شب کی دہلیز پہ گرتی ہیں، کبھی
کوئی مدہوش سی لے
جامۂ مے اوڑھ کے آتی ہے گزر جاتی ہے
رات کچھ اور بھی پھیل جاتی ہے
اور بڑھ جاتی ہیں خاموش کھڑی دیواریں

بے صدا صدیوں کے چھونے سے چٹخی دیواریں
جو کہ ماضی بھی ہیں، مستقبل بھی
جن کے پیچھے ہے کہیں
آتشِ لمحۂ موجود کہ جو
لمحۂ موجود کی حسرت ہے
مری نظم کی حیرت ہے، جسے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
گھومتا پھرتا ہوں میں برف بھری رات کی ویرانی میں

ان کہی نظم کی طغیانی میں
ہیں بھنور کتنے، گھُمر کتنے ہیں
کتنے اِلّا ہیں پسِ پردۂ لا
چشمِ نابینا کے آفاق میں ہیں

کتنے بے رنگ کرّے
کتنے دھنک رنگ خلا
کتنے سپنے ہیں کہ جو
شہر کے تنگ پُلوں کے نیچے
ریستورانوں کی مہک اوڑھ کے سو جاتے ہیں
کتنی نیندیں ہیں کہ جو اپنے شبستانوں میں
دیمک چاٹتی ہیں
جاگتی ہیں!

ہوا تالی بجاتی ہے

(تماشا ہو رہا ہے۔ اور
تماشائی لہو کے داغ پر داد و دہش کے پھول رکھتے ہیں
ہوا تالی بجاتی ہے)

"یہ میرا دوسرا ایں ہے
یہ میرا پہلا سچ اور دوسرا ایں ہے
جو کاغذ پر
سیاہی کی تہوں سے جھانکتا ہے
مسکراتا ہے

کبھی آنسو بہاتا ہے
کہ میرے خواب اکثر مجھ کو مجھ سے چھین لیتے ہیں"

"بہت غوغا ہے بازار انا الحق میں
بہت چھوٹا مرا پرچم
مرا نعرہ بہت مدہم
میں سچ کہنے سے ڈرتا ہوں
(یہ میرا دوسرا سچ ہے)
میں آدھا خواب اپنی آنکھ میں رکھتا ہوں
آدھا آسماں کو بخش دیتا ہوں
مرا یوسف کنویں میں ہے
ابھی مچھلی نے میرا سچ نہیں اُگلا "

"مرا لفظوں سے وعدہ تھا
ارادہ تھا کہ میں پتھر میں شریانیں بناؤں گا

میں کھارے پانیوں پر آگ سے وہ گیت لکھوں گا

جو زیرِ آب ہے اور بلبلوں کے استعارے بھیجتا ہے

——— وہیل، تیرے غار میں میرا ستارہ جگمگاتا ہے

رہائی دے

میرے سچ کو رہائی دے ...

(ہوا تالی بجاتی ہے)

سرِ پردہ تماشائی لہو کے داغ پر دادو دہش کے پھول رکھتے ہیں

پسِ پردہ کوئی ریشم کا کیڑا موت کی دھن پر لہو ریشم بناتا ہے

سرِ پردہ نہیں آتا!

سمندر یہ جو موتی ہیں کبھی یہ اُس کی آنکھیں تھیں؟

اس شہرِ خرابی میں

بڑا جنجال ہے
پنڈال میں واعظ بھی ہے اور مسخرے بھی ہیں

سرِ پردہ کئی سورج، کئی برگد
بہت سی انتہائیں ہیں
خموشی ہے
صدائیں ہیں
کنواں ہے موت کا یہ زندگی، جس میں
کبھی شب ناچتی ہے اور کبھی دن گھومتا ہے
آنکھ میں بجھتے ہوئے سورج لیے

پگھلا ہوا لوہا تری پلکوں سے گرتا ہے
مرے ہونٹوں پہ جمتا ہے!

اور ان پپڑی زدہ بوسوں کے صحرا میں
کوئی در کوئی دریا بن نہیں سکتا
مری جاں اب میں اس شہرِ خرابی کی تمنّا میں
تماشا بن نہیں سکتا!

نظم

پرندے کیسی دُھن ہے جو ترے پنجر میں بجتی ہے
ترے پنجرے میں جو یہ چاند اور سورج ہیں تجھ کو کیسے لگتے ہیں
تو کس کے واسطے یہ گیت گاتا ہے

نظم

اُداسی کوئی موسم تو نہیں ہے جو
فقط دو چار دن شاخوں پہ جھُولا جھولنے آئے
اُداسی تو جڑوں میں آشیاں تعمیر کرتی ہے!

○

اپنے جُھکنے کا گر یقیں ہوتا
میں فلک پر، کبھی زمیں ہوتا

تُو ہی تُو ہے مرے خرابے میں
کاش میں بھی کہیں کہیں ہوتا

اے دھوپ ٹھہر!

برگد ایک مسافر بھی ہے

برگد ایک مسافر بھی ہے
صدیوں کے رستے پر تنہا
صدیوں تک چلتا ہے، صدہا
چڑیوں کے ہمراہ اڑتا ہے

چڑیاں شام کی ویرانی میں
دھبّہ دھبّہ سو جاتی ہیں

برگد اپنی حیرانی میں
صدیوں کے رستے پر تنہا
صدیوں تک چلتا ہے، صدہا
صدیاں مٹی ہو جاتی ہیں

اے دھوپ ٹھہر

اے دھوپ ٹھہر!
کچھ دُور ٹھہر اس مٹی سے
یہ مٹی گیلی رہنے دے
اس مٹی سے ہم کوزہ گر
کچھ رنگ چرانے آئے ہیں
کچھ خواب ہیں گیلی مٹی کے
کچھ خواب ہیں سوکھے چشموں کے
ہم گوندھ کے ان سب خوابوں کو
اک نظم بنانے آئے ہیں
اِک نظم کہ تیرے جیسی ہو!

اِک نظم کہ جس کے سینے میں
اک سورج دھڑکے آنکھوں میں
اِک چاند چڑھے!
خوشبو میں ڈھلے دو ہاتھ اٹھیں
جھیلوں میں کھلے دو گال تپیں
دو پھول ہنسیں

کچھ دیر ٹھہر

کچھ دیر ابھی اِک کونپل پر
نیندوں کی شبنم رہنے دے
کچھ دیر ابھی ان ذرّوں میں
سپنوں کے دریا بہنے دے!

مَیں تیرا نوحہ کیسے لکھوں

(مرحوم اختر حسین جعفری کے لیے)

کہیں اک نقطے کی سُولی پر
برسوں کی چُپ کا کفّارہ
کہیں سُرخ رِبن کا تار کوئی
کہیں مانگ کا صندل بکھرا ہے

میں تیرے حرف کے زینے پر
میں تیری سطر کے شُہر میں ہُوں
میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں!

تجھے مجھ کو ابھی دکھانا ہے
وہ خواب کہ تُو نے دیکھا تھا
ابھی میرے دریا بھنور بھنور
ابھی میرے بادل دھواں دھواں
تجھے اپنی نظم سنانا ہے
مجھے اپنی پیاس بجھانا ہے

مجھے شام کے خالی رستوں پر
ابھی تجھ سے ملنے آنا ہے
میں کیسے وصل کی شاخوں سے
ابھی تیرے ہجر کے پھول چنوں
میں تیرے ہجر کے زینے پر
میں تیری سطر کے شہر میں
میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں!

اے شجر تیرے لیے

(احمد ندیم قاسمی کیلئے)

میں بھی لایا ہوں گلاب
میں بھی آیا ہوں مہک میں لپٹا
اے شجر تیرے لیے
میں تری چھاؤں اٹھا لایا ہوں
لے مرے پھول بھی لے
سن مری نظم بھی سن
نظم جو تیری شفق میں ڈوبی
نظم جو میرے افق سے پھوٹی
اے شجر تیرے لیے
میرے شجر تیرے لیئے !

○

سرِ پردہ فقط آواز ہونا
پسِ پردہ خدائے ساز ہونا

کبھی آنسو، کبھی نغمے کی صورت
کسی انجام کا آغاز ہونا

کسی کے واسطے وجہِ ندامت
کسی کے واسطے اعزاز ہونا

دن لمبے راتیں چھوٹی ہیں

دن لمبے، راتیں چھوٹی ہیں
آدھا دن باقی ہے
دُور دُور تک کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں ہے
کِسے بتاؤں
دن لمبے راتیں چھوٹی ہیں
آدھے دن کی راکھ مرے بالوں میں
آدھا دن باقی ہے!

شام کا برتن خالی

شام کا خالی برتن میرے ہاتھ میں
تیری آنکھ میں رات کا بپھرا دریا
چاند ستارے

رات کا پانی
قطرہ قطرہ خالی برتن میں گرتا ہے
چاند ستارے
اِدھر اُدھر سے آنکھیں مار کے چھپ جاتے ہیں!

○

چھوڑ سب کام وام رہنے دے
آج کی شام شام رہنے دے

اپنی شمشیر کو نیام میں رکھ
اسپ کو بے لگام رہنے دے

میرے جگنو مرے ستارے کو
مجھ سے محوِ کلام رہنے دے

میری آنکھوں میں آفتاب نہ رکھ
میری مٹی کو خام رہنے دے

اور جاوید اور سب تیرا
شام میری ہے، شام رہنے دے

وہ جو گونگے بہرے دن تھے
اب کہتے ہو اچھے دن تھے

دنوں کے پیچھے دیواریں تھیں
دیواروں کے پیچھے دن تھے

ٹھہری رات کا کالا جنگل
اُس میں آتے جاتے دن تھے

اِک دوجے کے مہماں تھے ہم
لیکن اپنے اپنے دن تھے

گو جاوید بہت تھوڑے تھے
پھر بھی اچھے خاصے دن تھے

بہت دن ہو گئے ہیں

بہت دن ہو گئے، اس باغ میں کوئل نہیں کُوکی
بہت دن ہو گئے، اس آنکھ نے سپنا نہیں دیکھا
عجیب بیکار سے دن ہیں
عجیب بیزار سی راتیں
نہ کوئی نظم ہوتی ہے
نہ کوئی یاد آتا ہے
بہت دن ہو گئے، اس شہر کی بے مہر گلیوں میں
کوئی سایہ دریچے کھٹکھٹاتا ہے ـــ جگاتا ہے
بہت دن ہو گئے کوئی نہیں جاگا
بہت دن ہو گئے کوئی نہیں سویا
بہت دن ہو گئے اس باغ میں کوئل نہیں کُوکی
بہت دن ہو گئے اس آنکھ نے سپنا نہیں دیکھا

ایک تصویر کے جواب میں

سمندر کے اُس پار برفیں پڑی ہیں
سمندر کے اُس پار تم برف پر چل رہی ہو
نگاہوں کو کتنی بھلی لگ رہی ہو !

سمندر کے اِس پار سے دو نگاہیں تمہیں دیکھتی ہیں
دعا مانگتی ہیں تمہارے لیے — تم
کہ ہریالیوں کو جگاتی ہوتی صبح سی لگ رہی ہو
خزاں کی تڑختی سِلوں میں
ٹھٹھرتے دِلوں میں یونہی دھوپ کا زر لٹاتی رہو
مسکراتی رہو

کٹی پھٹی ہے زمیں، آسماں ٹپکتا ہے
مرے یقین کی چھت سے گماں ٹپکتا ہے

سلگ رہا ہے بدن شاخِ سبز کی صورت
بجائے اشک مژہ سے دھواں ٹپکتا ہے

تجھے رموز و علائم میں قید کرتے ہیں
تو حرف حرف سے تیرا بیاں ٹپکتا ہے

غزل نہیں ترا غم ہے جو شیشۂ دل سے
برنگِ لالہ و گل جاوداں ٹپکتا ہے

یہ تیز دھوپ ہے بارش کے بعد کی جاویدؔ
گلی میں آگ بجھی ہے مکاں ٹپکتا ہے

○

اِک شب گزارنے کے اسباب ڈھونڈتے ہیں
تم خواب بیچتے ہو، ہم خواب ڈھونڈتے ہیں

جگنو ہیں یا ستارا، اس جھیل میں ہمارا
مہتاب کھو گیا ہے، مہتاب ڈھونڈتے ہیں

صحرا کی دھوپ اوڑھے دو ہنس ہیں جنہیں یہ
بادل کا روپ دھارے تالاب ڈھونڈتے ہیں

پلکوں پہ گرد اٹھاتے، آپ اپنی فرد اٹھائے
جاوید لوٹ آؤ احباب ڈھونڈتے ہیں

بے دلی بول میرے سینے میں
دل نہیں ہے تو ڈوبتا کیا ہے

گلدان کے تازہ گلاب کے نام

میں اسی دھوپ میں
اپنی بنجر ہتھیلی پہ بادل لیے
تیرے گھر آؤں گا
یار سونا نہیں
میں ترے واسطے
اپنے بستے میں بادِ صبا لاؤں گا
جنگلی جھاڑیاں
اور خرگوش بھی
آج تک
تیری خوشبو کی مستی میں مدہوش ہیں

تتلیاں

آج بھی
اپنے بوسے ہواؤں پہ لکھتی ہیں تیرے لیے
دیکھ شفاف شیشوں کی وسعت سے گھبرا کے رونا نہیں
میں اسی دھوپ میں
اپنی بنجر ہتھیلی پہ بادل لیے
تیرے گھر آؤں گا
یار سونا نہیں!

ہوا مقروض ہے میری

ہوا مقروض ہے میری
کہ اُس نے حرف تک میرے واپس نہ لوٹاتے
مرے گھر کا دھواں
گزری ہوئی شاموں کی خوشبو
بے ثمر آنسو
مرے مقتل، مری دیوارِ گریہ میں سجے چہرے واپس نہ لوٹاتے

ہوا مقروض ہے تیری
کہ اس کی مٹھیوں میں تیرے جگنو ہیں
ستارے ہیں
اشارے ہیں جو تُو نے غمزدوں کے نام بھیجے تھے
تری ہر حال میں بیدار کھڑکی میں لٹکتی مسکراہٹ اُس کی
جھولی میں گری، واپس نہیں آئی

ہوا مقروض ہے تیری
ہوا مقروض ہے میری
ترے جگنو شبِ غم تک نہیں پہنچے
مرے آنسو لحد سے دور دریا میں بہار آئی

آخری پہر

آنکھ میں سُرخیاں
فرش پر کرچیاں، راکھ مٹھی میں ہے
راکھ اُس خط کی ہے جو کہ لکھا نہیں
کرچیاں وعدۂ شامِ رفتہ کی ہیں
دُھند ہے

شیشۂ مے ہو یا شیشۂ چشم ہو
دُھند ہی دُھند ہے

دُھند میں پھول ہے روشنی کا جو سورج بنے گا
جو سورج بنے گا تو دیکھیں گے کِس آنکھ کی سرخیاں
اس کا مطلع بنیں
اور کِس آنکھ میں کرچیوں کی دھنک
دُور تک
دھند ہی دُھند ہے
پھُول ہی پھول ہیں!

اشکوں میں دھنک

تُو نہیں تو بتا

کون ہے ؟
تُو نہیں تو بتا کون ہے جو مجھے جانتا ہے
مجھے ہر گھڑی دیکھتا ہے مگر بولتا کچھ نہیں !

کس کی آنکھیں ہیں یہ
کس کا سایہ ہے یہ میری دیوار پر
میری دھڑکن میں میرے سوا کون ہے ؟

کس نے میری رگوں میں شرارے رکھے
میری تاریکیوں میں ستارے رکھے
اور بخشی مجھے راستے بھول جانے کی خُو

دَربَدر کُوبکُو
جو گناہوں کی مٹی میں مٹی ہوا بے فلک چاند تھا
بے وطن خواب ہُوں اور تُو جانتا ہے مجھے
تُو نہیں تو بتا کون ہے جو مجھے ہر گھڑی دیکھتا ہے ؟

وہ جو برگِ نور ہے خاک میں

وہ جو برگِ نور ہے خاک میں
مری ٹہنیوں پہ کب آئے گا
میں کہ داغ ہوں کسی صبح پر
مجھے پھول کون بنائے گا

مِرا خواب میری صلیب ہے
مرا حرف میرا رقیب ہے
مرا آسمان کمان ہے
کوئی دستِ غیر ہے تیر زن

مرے صبح و شام کے ہاتھ میں
کسی مرگ سال کی جنتری
کسی غرق شہر کا زائچہ
مرے بادباں پہ ہے رقم

میں سراب اپنی ہی ریت پر
مجھے آب کون بنائے گا
وہ جو برگ نوُر ہے خاک میں
مری ٹہنیوں پہ کب آئے گا

ذرا سا خواب اور گندھک

وہ جس کے پیٹ پر پتھر بندھے ہیں، وہ جو خندق کھودتا ہے،
وہ جو اپنے آنسوؤں سے ڈھال بُنتا ہے
ہمیں محفوظ رکھتا ہے جہنم سے
جہنم جو ہم اپنے گھر سے اپنے خون میں لے کر نکلتے ہیں
مگر جنت کا رستہ پوچھتے ہیں شام تک بازار کے گندھک فروشوں سے

ہمارے کھیت کی چاندی
ہمارے صحن کا سونا
شراب و میوۂ شیریں، ذرا سا خواب اور گندھک ہی گندھک ہے

کسی مرقد، کسی منبر کی تاریکی میں کوئی معجزہ جھلمل نہیں کرتا
بدن میں پھیلتا تیزاب اب خود کو لہو میں حل نہیں کرتا
بدن کو گھر سمجھتا ہے

وہ جس کے پیٹ پر پتھر بندھے ہیں آؤ اُس کے پاؤں پڑ جائیں
شکم کے واسطے کچھ بھوک مانگیں، کچھ دہن کے ذائقے
اور ذرّہ بھر سورج
کہ صحراؤں میں رکھے استخواں شب کی سیاہی میں لشکتے ہیں
دلی محسوس ہوتے ہیں

چلو آؤ
چلو آؤ وہ جس کے پیٹ پر پتھر بندھے ہیں اُس کے اک
آنسو میں ہم بھی غرق ہو جائیں
چلو آؤ کہ ہم بھی خندقیں کھودیں
اندھیرے کے یہ لشکر جانبِ مکہ سے آتے ہیں
مدینے میں پڑوسی بھی منافق ہے
گلاب دیا سمیں گندھک، بدن تیزاب کا گھر ہے!

اشکوں میں دھنک

اس ریتیلے بدن کی
جھلسی ہوئی رگوں میں
ہے تیل کا تماشہ
اور برف کی تہوں میں
ہے سورجوں کا گریہ
یا پانیوں کی دہشت
یا خشک سالیاں ہیں

مہتاب سے ٹپکتا
تاریکیوں کا لاوا
رخسار داغتا ہے
اس صبح کا ستارا
چڑیوں کے گھونسلوں میں
بارود بانٹتا ہے

ان چوٹیوں پہ پرچم
انجان وادیوں کے
اور وادیوں پہ دائم
انجان چوٹیوں کے
سایوں کی حکمرانی

یہ میرے آنسوؤں میں
رکھی ہوئی دھنک ہے
اِس حسن کی کہانی
نمکیں پانیوں کی
تسکین بن رہی ہے

ان سبز گنبدوں پر
بیٹھے ہوتے کبوتر
آنکھیں نہیں جھپکتے
اور برگدوں کے پیچھے
سوئے ہوئے پیمبر
خوابوں میں جاگتے ہیں

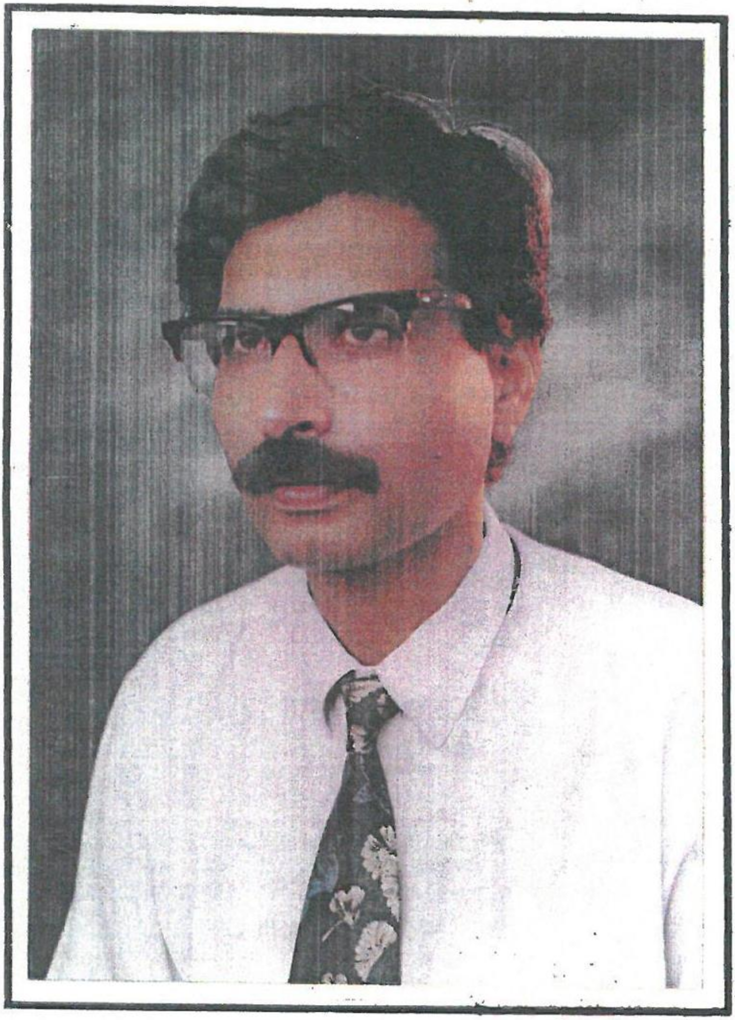
ان آئینوں پہ مٹی
ان کھڑکیوں میں جالے
یہ جام ریزہ ریزہ
یہ تشنہ لب نواگر
یہ بے نوا گداگر
اور ریتلے بدن کی
جھلسی ہوئی رگوں میں
ہے تیل کا خزانہ

اس برف کی تہوں میں

سیلاب کب بنے گا
یہ ریت کب ڈھلے گی
ان خشک ٹہنیوں میں
مہتاب کب بنے گا

صدیوں کا بوجھ اٹھاتے
صدیوں سے منتظر ہیں
قرطاسِ احمریں پہ
دھبے سے روشنی کے

لاریب یہ رسالت
لاریب یہ صحیفے
لیکن ترے اجالے
دیمک ہی چاٹتی تھی
دیمک ہی چاٹتی ہے



"میں زندگی کو نظم کرنے کا قائل ہوں۔ زندگی جس میں موت بھی ہے، زندگی، جو ایک ڈرامائی آہنگ ہے۔ ڈرامائی آہنگ جو آپ کو کارخانۂ حیات کے ہر نظام میں نظر آئے گا ——"

جاوید انور